Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:4 (1967)

قرآنِ مجید

از ڈاکٹر فضل الرحمٰن :: ترجمہ :: محمد سرور

قرآن کیا ہے؟

قرآن مجید سورتوں میں منقسم ہے، جو تعداد میں ۱۱۴ ہیں اور وہ طوالت میں بہت زیادہ غیر مساوی ہیں۔ شروع کی مکی سورتیں سب سے چھوٹی ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، وہ لمبی ہوتی گئیں۔ شروع کی سورتوں کی آیات غیر معمولی عمیق اور زبردست نفسیاتی تاثر کی کیفیت سے بھرپور ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہیں، لیکن تند و تیز آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ کر نکلتی ہیں۔ ایک آواز ہے جو زندگی کی حقیقی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے اور وہ بڑی قوت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے ٹکراتی ہے تاکہ وہ شعور کی سطح پر اپنے آپ کو واضح و نمایاں کر سکے۔ یہ لہجہ بتدریج، بالخصوص مدنی دور میں، زیادہ رواں اور آسان اسلوب میں بدل جاتا ہے، جب ان آیات میں نئی نئی ملّی ریاست کی تفصیلی تنظیم اور رہنمائی کے لیے قوانین کا حصہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ یقیناً یہ نہیں کہہ سکتے کہ یا تو یہ آواز خاموش ہوگئی یا یہ کہ اس کی شدت میں تبدیلی آگئی۔ ایک مدنی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے۔ ولو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ - (۵۹ - ۲۱) (اگر ہم اتارتے یہ قرآن پہاڑ پر تم اسے دیکھتے کہ وہ (اس حکم کے سامنے) فرماں برداری سے جھک جاتا اور (اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔) بات یہ ہے کہ خود تفویض کردہ کام بدل گیا تھا۔ خالص اخلاقی اور مذہبی تلقین کے جوش و خروش اور ہیجان کے بجائے قرآن ایک حقیقی معاشرتی تنظیم کو بروئے کار لانے کی منزل میں داخل ہو چکا تھا۔

خود قرآن اپنی نظر میں اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے اللہ کا کلام ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے 'جو قطعی طور سے اس دنیا سے ماوراء ہے' رسول ہیں (ہم قطعی طور سے اس ماوراء ہونے کے مفہوم کو زیادہ تعین سے واضح کرنے کی ابھی کوشش کریں گے)۔ آپ کو اس پر اتنا یقین تھا کہ آپ نے اپنے اس شعور کی بنیاد پر حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں کے بارے میں یہودی مسیحی روایت کے بعض سب سے بڑے بنیادی تاریخی دعوؤں کو مسترد کر دیا۔ اس ماوراء وجود نے بعض ذرائع سے کامل اختیار کے ساتھ قرآن کا 'القاء' کیا۔ زندگی کی گہرائیوں کی یہ آواز نہایت وضاحت سے، بغیر کسی غلطی کے، اور پورے تحکم اور جلال کے ساتھ گویا ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ 'قرآن کا لفظ' جس کے معنی 'قرأۃ' یعنی پڑھنے کے ہیں، بڑی صراحت سے بتاتا ہے، بلکہ خود قرآن کا متن متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کرتا ہے کہ قرآن لفظاً نہ کہ محض معناً بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ اس طرح کے نزول کے لیے قرآنی اصطلاح وحی ہے، جو بہت حد تک اپنے مفہوم میں 'الہام' سے نزدیک ہے، بشرطیکہ اس آخرالذکر سے یہ مراد نہ ہو کہ اس میں لازماً الفاظ نہیں ہوں گے۔ ('لفظ' سے بہرحال ہماری مراد الفاظ کی آواز سے نہیں) قرآن کہتا ہے:۔ وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورائ حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم ۔ وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ... (۴۲—۵۱—۵۲)۔ (اللہ کسی انسان سے بات نہیں کرتا (یعنی آواز و اے الفاظ کے ساتھ) مگر وحی سے (یعنی الفاظ کے معانی کا الہام کر کے) یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کوئی بھیجے پیغام لانے والا (فرشتہ) اور وہ اللہ کی مرضی سے وحی پہنچائے بے شک اللہ سب سے بلند اور حکیم ہے۔ اور اس طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے امر کی روح وحی کی ....)

جب دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں میں وحی کی نوعیت کے متعلق سخت قسم کے اختلافات آراء اور بحثیں جو ایک حد تک مسیحی عقائد سے متاثر تھیں، شروع ہوئیں تو نئی نئی ظہور پذیر راسخ العقیدگی نے جو اس وقت اپنے معین معتقدات کی تشکیل کی نازک و فیصلہ کن منزل میں تھی، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی وحی کی خارجیت (یعنی اس کا نزول خارج سے ہوتا تھا) پر بہت زور دیا تھا کہ وہ اس طرح وحی کی ماورائیت معروضیت اور لفظاً نازل ہونے کی حیثیت کو محفوظ و مستحکم کر سکے

یقیناً قرآن نے خود وحی کی 'ماورائیت' معروضیت اور اس کے لفظاً نازل ہونے کا اثبات کیا ہے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی طرح اس نے یقیناً وحی کی خارجیت کو یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کے مقابلے میں مسترد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین۔ (۲۶-۱۹۴)۔ (یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کی گئی ہے الروح الامین اسے لے کر اسے تیرے دل پر اترا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو)۔ نیز قرآن کا ارشاد ہے:۔ قل من کان عدواً لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک (۲-۹۷)۔ (کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے (سو ہوا کرے)۔ بس وہی ہے جس نے اس کلام کو تمہارے دل پر نازل کیا)۔ لیکن راسخ العقیدگی (اور یقیناً قرون وسطی کا تمام فکری سرمایہ) ایسے ضروری عقلی ذرائع سے محروم تھی، جن سے ایک طرف وہ اپنے نظام معتقدات کی تشکیل میں وحی کی ماورائیت اور لفظاً نازل ہونے کی حیثیت اور دوسری طرف پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل اور آپؐ کی مذہبی شخصیت کو باہم ملا سکتی۔ یعنی یہ راسخ العقیدگی اتنی عقلی استعداد نہ رکھتی تھی کہ یہ دونوں باتیں کہہ سکتی کہ قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے اور عام معنوں میں یہ اسی طرح پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی ہے۔ یہ واضح ہے کہ قرآن ان دونوں باتوں کو مانتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ قرآن کا نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے 'قلب' پر ہوا ہے' تو وہ آپؐ سے ایک خارجی چیز کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن بہر حال ضروری نہیں کہ اس کے یہ معنی ہوں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے' ایک متشکل ہیئت کو بھی نہیں دیکھا' لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس بارے میں خود قرآن کسی ایسی متشکل ہیئت کا ذکر نہیں کرتا۔ یہ ذکر صرف بعض مخصوص روحانی تجربات کے بارے میں ہے (جو عام طور سے معراج نبویؐ سے متعلق ہیں)، کہ قرآن بتاتا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک متشکل ہیئت یا روح یا کسی دوسری چیز کو' سدرۃ المنتہیٰ' یا' بالافق الاعلیٰ' پر دیکھا۔ گو اس جگہ بھی جیسا کہ ہم پچھلے باب کی پہلی فصل میں بتا آئے ہیں' اس تجربے کو ایک روحانی تجربے کے طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن راسخ العقیدگی نے حدیث یا رسول اللہؐ سے مروی روایات کے ذریعہ جو کسی قدر مناسب و موزوں تعبیرات تھیں اور کس قدر گھڑ لی گئی تھیں اور علم دینیات کی مدد سے جو زیادہ تر حدیث پر مبنی تھا' پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کو تمام تر کانوں سے سنی جانے والی اور آپؐ کی ذات سے خارج چیز بنا دیا اور اس فرشتے اور' الروح الامین' کو جو آپؐ کے دل پر وحی لے کر نازل ہوتا تھا' تمام تر ایک خارجی عامل قرار دے دیا۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کی آج مغرب نے جو تصویر کھینچ

رکھی ہے اس کا زیادہ تر انحصار قرآن کے بجائے راسخ العقیدگی کے اس تشکل عقیدے پر ہے۔ جیسے کہ ایک عام مسلمان بھی مانتا ہے۔

اس کتاب میں اس کی گنجائش نہیں کہ قرآنی وحی کے نظریے کی تفصیل سے وضاحت کی جائے۔ پھر بھی اگر ہمیں تاریخ اسلام کے حقائق سے بحث کرنا ہے تو خود قرآن نے اپنے متعلق جو کچھ واقعتاً کہا ہے اس پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ذیل کے مختصر سے خاکے میں ان تاریخی اور اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم واضح طور پر پچھلے باب میں اس کی صراحت کر آئے ہیں کہ قرآن کا بنیادی روحانی محرک اخلاقی ہے اور اسی سے اس کا توحید اور ساتھ ساتھ اجتماعی عدل پر زور دیتے کا سوتا پھوٹتا ہے۔ اخلاقی قانون غیر متغیر ہے۔ یہ امر اللہ ہے انسان نہ تو اخلاقی قانون بنا سکتا ہے اور نہ اسے ختم کر سکتا ہے۔ انسان کو اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کا اسے اس طرح تسلیم کرنا 'اسلام' کہلاتا ہے اور اس کو زندگی میں عملی شکل دینا 'عبادت' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن نے چونکہ اخلاقی قانون پر سب سے بڑھ کر زور دیا ہے، اسی لیے قرآن کا خدا بہت سے لوگوں کو مقدماً خدائے عدل نظر آتا ہے۔ لیکن اخلاقی قانون اور روحانی قدروں پہ اگر عمل ہونا ہے تو لازمی ہے کہ انہیں جانا جائے۔ اب حالت یہ ہے کہ چیزوں کا ادراک کرنے کی استعداد میں لوگوں میں واضح طور پہ غیر محدود اختلاف پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اخلاقی اور مذہبی ادراک خالص عقلی ادراک سے بھی بہت زیادہ مختلف ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر کا اصلی و ذاتی وصف یہ ہوتا ہے کہ یہ ادراک کے ساتھ 'سنجیدگی' کا غیر معمولی احساس ساتھ لاتا ہے اور ادراک کرنے والے کو نمایاں طور پہ تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ادراک نیز اخلاقی ادراک کے بھی درجے ہیں۔ اس میں صرف مختلف افراد ہی میں اختلاف نہیں ہوتا بلکہ اس نقطہ نظر سے ایک ہی معین فرد کی باطنی زندگی مختلف اوقات میں مختلف ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں حقیقی اخلاقی اور عقلی نمو اور ارتقا کا ذکر نہیں کر رہے، جس میں کہ اختلاف بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے، بلکہ ایک اچھے اور پختہ آدمی میں بھی جس کا عام معیاری عقلی اور اخلاقی کردار ایک لحاظ سے راسخ ہو چکا ہے، اس طرح کے اختلافات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

اب پیغمبر کی ایسی شخصیت ہوتی ہے جس کا عام معیاری اور مجموعی کردار جو اس کے عملی اطوار و اخلاق کا پورا خلاصہ ہوتا ہے، کہیں زیادہ اعلیٰ و برتر ہوتا ہے عام انسانیت کے کرداروں سے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے، جو روز اول سے لوگوں بلکہ ان کے اکثر نصب العینوں کے بارے میں بڑی

بے تاب ہوتی ہے اور تاریخ کی نئی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ اسی بنا پر مسلم راسخ العقیدگی نے منطقی طور پر یہ صحیح نتیجہ نکالا کہ پیغمبروں کو سنگین قسم کی غلطیوں سے لازماً معصوم ماننا چاہیئے (یہی عصمۃ الانبیاء کا عقیدہ ہے)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شخصیت تھے۔ درحقیقت ایسی شخصیت صرف وہی تھے، جس سے کہ صحیح معنوں میں تاریخ واقف ہے۔ اسی لیے آپ کا مجموعی اُسوہ مسلمانوں کے نزدیک سنت یا ایک 'مثالی نمونہ' مانا جاتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایسے لمحات بھی آتے تھے، جب کہ آپؐ، جیسا کہ ہوتا تھا اپنے آپ سے پرے "گزر جاتے تھے۔ اور آپ کا اخلاقی عارفانہ ادراک اتنا تیز اور شدید ہو جاتا کہ آپ کا شعور اور خود اخلاقی قانون ایک ہو جاتے۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔ وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلنہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا۔ (۴۲ - ۵۲)۔ (اور ہم نے تمہیں اپنے امر کی روح کی وحی کی۔ تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کو۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ ہدایت دیں اس سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں)۔ اخلاقی قانون اور مذہبی قدریں اللہ کا امر ہیں۔ اور گو وہ پوری طرح اللہ کی عین نہیں، لیکن وہ اس کا حصہ ضرور ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن خالصاً کلام اللہ ہے۔ مزید برآں حتیٰ کہ جہاں تک عام شعور کا تعلق ہے، یہ غلط خیال ہے کہ تصورات اور احساسات اس شعور میں تیرتے پھرتے ہیں اور انہیں مکانکی طور پر الفاظ کا لباس پہنایا جا سکتا ہے۔ احساسات، تصورات اور الفاظ کے درمیان یقیناً ایک نامیاتی وفطری رشتہ پایا جاتا ہے۔ الہام حتیٰ کہ شاعرانہ الہام میں بھی یہ رشتہ اتنا مکمل ہوتا ہے کہ احساس، تصور، لفظ سب مل کر ایک پیچ در پیچ کل بن جاتے ہیں، جس کی کہ خود اپنی زندگی ہوتی ہے۔ جب رسول اللہ صلعم کا اخلاقی وجدانی ادراک ترقی کر کے بلندترین درجے پر پہنچا اور وہ ادراک خود اخلاقی قانون کا عین بن گیا۔ (بے شک ایسے لمحات میں بعض معاملات میں خود آپؐ کا اپنا عمل اور برتاؤ قرآن کی تنقید کا نشانہ بنا جیسا کہ پچھلے باب کی دوسری فصل میں بتایا گیا ہے۔ اور جیسا کہ یہ قرآن کے صفحات میں واضح طور پر ملتا ہے) تو الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوا، چنانچہ قرآن خالصاً کلام الٰہی ہے۔ لیکن بے شک اس کے ساتھ وہ اتنا ہی پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی عمیق ترین شخصیت سے بہت زیادہ مربوط ہے۔ اور قرآن اور آپؐ کی شخصیت کے اس ربط کا تصور مکانکی طور پر اس طرح نہیں کیا جا سکتا جیسے کہ فونوگراف اور ریکارڈ کا ربط ہے۔ کلام الٰہی کا سوتا پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے قلب سے پھوٹ کر بہا ہے۔

لیکن اگر رسول اللہ صلعم اپنے قرآنی لمحات میں، یعنی جب آپؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا، اخلاقی قانون کے ساتھ ایک ہوجاتے تھے تو آپؐ کو نہ تو خدا کے ساتھ کلیتہً اور نہ اس کے ایک جزو ہی کے ساتھ ملا دینا چاہیے قرآن صاف اور قطعی طور پر اس کا انکار کرتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے بڑی سختی سے اس سے احتراز کیا ہے اور تمام مسلمانوں نے جو اس نام کے مستحق ہو سکتے ہیں، مخلوق کو خدا کے ساتھ شریک کرنے کو جسے شرک کہا جاتا ہے، بہت بڑا سنگین گناہ قرار دے کر مذموم ٹھہرایا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے تاکہ کوئی آدمی یہ نہ کہے "میں ہوں اخلاقی قانون"۔ آدمی کا تو فرض منصبی یہ ہے کہ وہ بڑی احتیاط سے اس اخلاقی قانون کو ضابطے کی شکل دے۔ اور اپنی تمام جسمانی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ اس کی اطاعت کرے۔ سوا اس کے اس فقرے کے کہ "فلاں اور فلاں الٰہی حکم ہے"، اسلام کے نزدیک اور کوئی معنی نہیں ہیں۔

قرآنی تعلیمات

اس سے پہلے ہم بار بار اس پر زور دے چکے ہیں کہ قرآن کا بنیادی روحانی محرک اخلاقی ہے اور فوراً اس کے ساتھ ہی اس سے منتج عدلِ اجتماعی و معاشی کے جو تصورات قرآن میں بیان ہوئے، ہم ان کی نشاندہی کر آئے ہیں۔ جہاں تک انسان اور اس کے مقدر کا تعلق ہے، یہ بالکل صحیح ہے۔ جیسے جیسے قرآن نے بتدریج اپنے عالمی تصور کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا، انسانوں کے لیے اخلاقی نظام کائناتی نظام کی جو نہ صرف اعلیٰ مذہبی حساسیت سے بھرپور ہے، بلکہ وہ حیرت انگیز درجے پر ربط باہمی اور یکسانیت کا مظاہرہ کرتا ہے، پوری تصویر میں مرضیٔ الٰہی کے مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔

کائنات کے خالق مطلق ہونے کی حیثیت سے خدا کا تصور اس طرح ارتقا پذیر ہوتا ہے کہ اس میں تخلیق، نظم و انصرام اور رحمت کی صفات محض باہم ملی ہوئی اور ایک دوسرے سے ملحق نہیں بلکہ وہ پوری طرح ایک دوسرے کے اندر سرایت کی ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:- الا لہ الخلق والامر (٧-٥٤)، (سن لو اسی کے لیے تخلیق اور امر ہے)، ورحمتی وسعت کل شیء (٧-١٥٦) (اور میری رحمت ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا کا توصیفی نام صرف رحمٰن ہی ہے جو قرآن میں خدا کے ذاتی نام کے طور پر اللہ کے علاوہ بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے جیسا کہ جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ اسلام

سے پہلے جنوبی عرب میں دیوتا کے لیے جسے خدا مانا جاتا تھا، رحمٰن کا لفظ بطور نام کے استعمال ہوتا تھا لیکن جنوبی عرب سے اس لفظ کے تاریخی انتقال کی اس حقیقت کا ہمارے نقطہ نظر سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہم وقتی طور پر انسان یعنی اس کی مخصوص روحانی اخلاقی تکوین کو۔ ایک طرف رہنے دیں اور باقی تمام تخلیق شدہ کائنات پر غور کریں تو اوپر کی ان تین اساسی صفات کی تعبیر یہ ہو گی کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے۔ اور اس تخلیق کے دوران چیزوں میں نظم یا ' امر' ودیعت کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان میں ربط باہمی رہتا ہے اور بجائے اس کے کہ مقررشدہ راستے سے اِدھر اُدھر انحراف کریں وہ ایک نظام کی پابند رہتی ہیں۔ اور یہ سب ارتقاء پذیر ہو کر ایک کائنات کو ترتیب دیتی ہیں۔ اور یہ کہ آخر میں یہ سب کچھ بھی نہیں سوائے اللہ کی رحمت اور صرف رحمت کے۔ کیونکہ بہرحال کسی چیز کا وجود خود اس کا اپنا ذاتی اور مستقل استحقاق تو ہے نہیں۔ کہ چیزوں کے اس وجود کے بجائے خالص خلا اور عدم محض بھی بالکل اسی طرح ہو سکتا تھا

سب سے گہرا تاثر جو قرآن بحیثیت مجموعی اپنے ایک پڑھنے والے پر چھوڑتا ہے، وہ بے شک ایک سب کی خبر رکھنے والے غضب ناک اور سزا دینے والے خدا کا نہیں جیسا کہ عیسائیوں نے عام طور پر قرآن سے لیا ہے اور نہ ایک بڑے جج اور حاکم عدالت کا ہے جیسا مسلمان قانون دانوں کا سوچنے کا رجحان ہے بلکہ ایک واحد اور بامقصد ارادہ کا ہے جو عالم کون و مکان میں نظم و ضبط کا خالق ہے۔ قوت یا عظمت یا باخبری یا عدل اور حکمت و دانائی کی صفات جن پر قرآن میں بغیر کسی کوتاہی کے زور دیا گیا ہے، وہ درحقیقت کائنات میں تخلیقی نظم و ضبط سے براہ راست منتج ہوتی ہیں۔ قرآن کی تمام اصطلاحات میں سے شاید سب سے بنیادی ہمہ گیر اور اس کے ساتھ عالم کون و مکاں کی الہیاتی فطرت کی ترجمانی کرنیوالی اصطلاح 'امر' ہے جس کا ترجمہ ہم نے اوپر نظم و ضبط، حسن ترتیب یا حکم کیا ہے۔ جو بھی چیز تخلیق ہوئی ہے' اسے خود بخود اس کا 'امر' کر دیا گیا ہے جو خود اس کے وجود کا اپنا قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسا قانون بھی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چیز ایک نظام کے اندر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ یہ 'امر' یعنی نظم و ضبط یا خدا کا حکم برابر جاری رہتا ہے۔ تمام اشیاء کو 'امر' کے القا کرنے کی جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور جن میں انسان بھی شامل ہے وہ 'وحی' ہے۔ جس کا ترجمہ ہم نے اوپر کی تفصیل میں 'الہام' کیا ہے۔ غیر نامیاتی اشیاء کے بارے میں اس کا جو ذکر ہے اس کا ترجمہ یوں کرنا چاہیئے کہ یہ ان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جہاں تک

انسان کا تعلق ہے جس کا کہ خصوصی اور جدا معاملہ ہے، اس کو آسمان سے صرف 'امر' نہیں، بلکہ جیسا کہ قرآن بار بار ہمیں بتاتا ہے 'روح من الامر' بھی عطا ہوئی ہے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اور اسی طرح جنوں کا بھی، جو انسان ہی کی مثل نہ آنے والی مخلوق کی ایک قسم ہے، لیکن آتشیں عنصر سے پیدا کی ہوئی بتائی جاتی ہے۔ یہ انسان ہی کی ایک طرح کی نقل ہے، جس کا بدی کی طرف زیادہ رجحان ہے اور اسی میں سے شیطان کی پیدائش بتائی جاتی ہے۔ فطرت اور 'امر' کے ذریعہ جو کچھ اسے عطا ہوا ہے، وہ دونوں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں" کیونکہ 'امر' یہاں حقیقت میں اخلاقی قانون بن جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جو واقعتاً نظم و ضبط ہے، بلکہ واقعتاً جو نظم و ضبط نہیں ہے اس میں نظم و ضبط کو بروئے کار لاتا ہے۔ اخلاقی عدم نظم و ضبط نتیجہ ہے ایک گہری راسخ اخلاقی حقیقت کا، جس سے خدا اور آدمی دونوں کو مل کر عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ اور یہ حقیقت عبارت ہے اس سے کہ انسان کا معاصر شیطان ہے، جو اسے برابر بہکاتا رہتا ہے۔

انسان کے کردار میں جو اخلاقی دوئی ہے اور جو سبب بنتی ہے اخلاقی جد و جہد کی نیز وہ امکانی قوتیں جن کا انسان اور صرف انسان ہی حامل ہے۔ ان کا نقشہ قرآن دو بڑے اثر انگیز قصوں کے ذریعہ کھینچتا ہے۔ ایک قصے کے مطابق جب خدا نے انسان کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ انسان بدی کی طرف مائل ہوگا وہ زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا، جب کہ وہ پوری طرح مرضی الٰہی کے فرماں بردار ہیں۔ اس پر خدا کا جواب یہ تھا۔ 'انی اعلم ما لا تعلمون' (۲-۳۰)۔ (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔ دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب اللہ نے 'امانت' آسمانوں اور زمین کو پیش کی تو ساری مخلوقات نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ انسان آگے بڑھا اور اس نے اسے اپنے ذمے لے لیا۔ اس قصے کو اس طرح بیان کر کے 'انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان'، آخر میں خدا کی طرف سے ہمدردانہ یوں تنبیہہ ہے: 'انہ کان ظلوماً جھولا' (۳۳-۷۲)- (اور وہ زیادتی کرنے والا اور جاہل ہے)۔ انسانی مقام اور انسان کی کمزور اور ٹھوکر کھانے والی فطرت کی اس سے بڑھ کر دلنشیں اور مؤثر تصویر کشی بمشکل ہی ہو سکے گی، تاہم یہ انسان کی جبلی جرأت اور واقعیت سے گزر کر قابلیت تک اپنے کا اس کا ارادہ ہے جو اسے یکتائی اور عظمت عطا کرتا ہے۔ یہ جو انسان کے ساتھ ساتھ شیطان

ہے 'یہ حقیقت انسان کے لیے ایک بالکل نئی وسعت پیدا کر دیتی ہے، اللہ نے بتایا کہ قرآن بتاتا ہے:'
'فالھمہا فجورھا و تقوٰھا' (۹۱ - ۸)۔ (نفسِ انسانی میں نیکی اور بدی کی تفریق کی صلاحیت ودیعت کی ہے)
لیکن شیطان اتنی عیاری اور زوردار طریقے سے پھسلاتا ہے کہ خدا نے قلبِ انسانی پر دائمی طور پر جو کچھ نقش کر رکھا ہے، لوگ اسے ٹھیک طرح پہچان بھی نہیں پاتے اور بعض جو پہچان سکتے ہیں، وہ کافی مضبوطی سے اس سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ حرکت میں آتے ہیں۔ ایسے نازک حالات میں اللہ کچھ انسانوں کو منتخب کرتا ہے اور ان کی طرف فرشتہ یعنی روحاً من امرنا جو خود اس سے ہے بھیجتا ہے یہ 'امر' جو خود اس سے ہے (روحاً من امرنا) اتنا یقینی اور جو کچھ اثبات کرتا اور جس سے وہ منع کرتا ہے، وہ اس قدر واضح و قطعی ہے کہ یہ درحقیقت 'کتابِ مکنون' ہے جو 'لوحِ محفوظ' پر لکھی ہوئی ہے۔ اور 'ام الکتاب' ہے[1] جن لوگوں کو انسانیت کے لیے یہ اہم اور فیصلہ کن پیغام دیا جاتا ہے، وہ پیغمبر ہیں۔ قرآن جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، وہ ایسی کتاب ہے وہ امر اللہ کی وحی کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کرتی ہے۔ آخری پیغمبر ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے جس کی وحی کی گئی ہے۔

چنانچہ اس پس منظر میں قرآن ایک ایسی دستاویز کے طور پر سامنے آتا ہے جو شروع سے آخر تک ان تمام اخلاقی کشاکشوں پر زور دینا چاہتا ہے جو انسان کے تخلیقی عمل کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بنیادی اعتبار سے قرآن کا مرکز انسان اور اس کی فلاح ہے اور اسی بنا پر لازمی ہے کہ انسان بعض مخصوص کشاکشوں کے نقشے کے اندر جو یقیناً اللہ ہی نے اس کے اندر پیدا کی ہے برسرِ عمل ہو۔ اس ضمن میں پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان لپک کر اس نتیجے پر نہ پہنچے، جو اس کے لیے خودکشی کا مترادف ہے کہ وہ اخلاقی قانون کو اس واضح حقیقت کی بنا پر، کہ وہ ہے تو اسی کے لیے، اپنی دلی خواہش کے مطابق بنا اور توڑ سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں اللہ کی کامل و مکمل برتری اور عظمت پر سب سے زیادہ نمایاں طور پر زور دیا گیا ہے۔ دوسری طرف تمام مخلوقات میں سے آدمی کو عظیم ترین امکانی قوتیں دی گئیں اور اسے

---

[1] انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطھرون (۵۶ - ۸۰)

بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ (۸۵ - ۲۱ - ۲۲)

وعندہ ام الکتاب (۱۳ - ۳۹)

اس 'امانت' کا حامل بنایا گیا، جسے قبول کرتے وقت ساری مخلوق ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ مزید برآں یہ اخلاقی قانون کی برتری ہی ہے، جس سے کہ عدل کا تصور جس پر کہ قرآن نے اتنے ہی شد و مد سے زور دیا ہے، براہ راست مترشح ہوتا ہے لیکن اسی تاکید کے ساتھ قرآن مایوسی اور خدا کی رحمت پر بھروسہ نہ کرنے کی جسے وہ بنیادی لحاظ سے کفر قرار دیتا ہے، مذمت کرتا ہے۔ یہی بات اخلاقی کشاکشوں کے پورے دائرے پر، جن میں انسانی قوت اور کمزوری، علم اور جہالت اور تکلیف اٹھانا اور بدلہ لینا وغیرہ شامل ہے، صادق آتی ہے۔ جہاں انسان کی امکانی قوتیں بہت زیادہ ہیں اسی قدر سزائیں اور صعوبتیں بھی بہت زیادہ ہیں جن کا انسان کو اپنی ناکامی کے نتیجے کے طور پر لازماً سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس نقشے کے مطابق قرآن سے اسلام کا جو نظام عقائد نکلتا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی ایک خدا کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے سے فرشتوں (ارواح 'من امرنا') کا جو انسان تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں، پیغمبروں کا، جو وحی الٰہی کے انسانی حامل ہیں، (اس سلسلے کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) پیغمبروں کے پیغاموں (کتابوں) کے حق ہونے یعنی روز حساب کا عقیدہ مترتب ہوتا ہے۔

قرآن نماز پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ وہ برائیوں سے روکتی ہے (تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) اور انسان کو مشکلات پر قابو پانے میں جب نماز یعنی 'صلوٰۃ' کے ساتھ صبر بھی ہو، مدد دیتی ہے۔ گو پوری پانچ نمازوں کا قرآن میں ذکر نہیں، لیکن انہیں خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری سالوں کے عمل کا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس خیال کی تاریخی اعتبار سے تائید کرنا ناممکن ہوگا کہ مسلمانوں نے خود اپنی طرف سے تین نمازوں کے ساتھ جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، دو نئی نمازوں کا اضافہ کر دیا۔ خود قرآن میں صبح اور شام کی دو نمازوں کا ذکر ہے۔ بعد میں دوپہر کی نماز (صلوٰۃ وسطیٰ) کا مدینہ میں اضافہ ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی زندگی کے آخری سالوں میں 'اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل' (نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک) کی ایک نماز کو دو میں تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح دوپہر کی ایک نماز کو بھی (چنانچہ یوں پانچ نمازیں ہو گئیں۔

بہر حال یہ حقیقت کہ بنیادی طور پر نمازیں تین تھیں، اس کی شہادت اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ ایک روایت ہے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بغیر کسی وجہ کے ان چار نمازوں کو دو نمازوں میں جمع کر دیا تھا۔ بہر حال یہ عہد نبوی کے بعد کے زمانے میں ہوا ہے کہ نمازوں کی تعداد، بغیر ان کی کسی متبادل

تعداد کے، بڑی سختی سے پانچ معین کر دی گئی۔ اور یہ حقیقت کہ بنیادی طور پر نمازیں تین ہیں، احادیث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے نیچے، جو نمازوں کے پانچ ہونے کی تائید میں روایت کی گئیں، دب کر رہ گئیں،

ایک ماہ کے روزے، پو پھٹے سے لے کر غروب آفتاب تک پوری طرح کھانے اور پینے کی کافی حد تک کٹھن بندش، قرآن میں فرض کیے گئے ہیں۔(۲-۱۸۳) ۔ جو بیمار ہوں یا سفر میں (مشکلات سے) دو چار ہوں، وہ دوسرے زیادہ مناسب وقت میں روزے رکھ سکتے ہیں۔ قرآن کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ اس کے نزول کا آغاز، رمضان میں ہوا تھا۔

جب تک مکّے میں مسلمانوں کی ایک مختصر سی تعداد رہی، صدقہ و زکوٰۃ پر گو بار بار زور دیا جاتا رہا، لیکن اس کی حیثیت رضا کارانہ عطیات ہی کی رہی جن سے مقصود مسلم جماعت کے زیادہ غریب طبقے کی امداد کرنا تھا۔ مدینہ میں بہرحال زکوٰۃ، جو ایک طرح کا فلاحی ٹیکس تھا، جماعت کی فلاح و بہبود کی غرض سے باقاعدہ طور پر فرض کی گئی، اور اس کو جمع کرنے کے لیے کارندے مقرر کیے گئے۔ زکوٰۃ پر قرآن کا اتنا زیادہ زور ہے کہ زکوٰۃ کے بغیر نماز تک کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ سُود کی بندش، جس کی اخلاقی لحاظ سے مذمّت مکّہ ہی میں شروع ہو گئی تھی، مسلسل احکامات کے ذریعہ عمل میں آئی۔ ایک حکم میں ان لوگوں کے بارے میں جو سودی کاروبار کرتے تھے، یہ کہا گیا ہے کہ وہ گویا خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس طرح قرضِ اصل رقم سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے اور یہ سُودی کاروبار جائز طریقے کی خرید و فروخت کے مخالف ہے۔

مکّہ میں خانہ کعبہ کا حج زندگی میں ایک مرتبہ ہر مسلمان کے لیے جو وہاں تک جانے کی استطاعت (من استطاع الیہ سبیلا) رکھتا ہے فرض کیا گیا ہے۔ 'من استطاع الیہ سبیلا' کے معنی صرف یہ نہیں کہ وہ مکّہ جانے اور وہاں سے آنے کے مصارف برداشت کر سکتا ہے، بلکہ یہ بھی ہیں کہ وہ اپنی غیر موجودگی کے عرصے کے لیے اپنے خاندان کے مصارف کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔ مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے مسلمانوں میں اسلامی اخوّت اور اتحادِ اسلام کے جذبے کو بڑھانے میں حج ایک بڑی قوی الاثر ذریعہ رہا ہے۔

قرآن مومنوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جہاد کریں یعنی یہ کہ وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں

کو اللہ کی راہ میں دیں (وتجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ۶۱ - ۱۱) اور جہاد کا مقصد یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں نمازیں قائم ہوں۔ زکوٰۃ دی جائے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا انتظام ہو مطلب یہ کہ اسلام کا معاشرتی واخلاقی نظام بروئے کار آئے۔ جب تک مسلمان مکہ میں ایک چھوٹی سی ستم رسیدہ اقلیت تھے، جہاد کا اسلامی تحریک کے ایک مثبت ومنظم اقدام کی حیثیت سے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال مدینہ میں صورتِ حال بدل گئی اور بعد ازاں نماز اور زکوٰۃ کے امکانی استثناء کے بمشکل ہی کوئی ایسی چیز تھی، جس پر جہاد سے زیادہ زور دیا گیا ہو۔ تاہم بعد کے اسلامی فقہی مذاہب میں صرف متشدد خارجی ہی تھے، جنہوں نے جہاد کو ایمان کا ایک رکن قرار دیا ہے، دوسرے فقہی مذاہب نے اس واضح سبب کی بنا پر اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ملتِ اسلامی کے داخلی استحکام کے مقابلے میں اسلام کی توسیع بہت زیادہ سرعت سے ہو چکی تھی۔ ہر پُر زور اور توسیع پذیر نظریہ حیات کو ایک منزل پر اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا ہوتا ہے کہ دوسرے نظاموں سے اگر اسے بقائے باہمی منظور ہے تو اس کے کیا شرائط ہیں اور وہ براہ راست توسیع کے ذرائع کتنی دور تک بروئے کار لا سکتا ہے۔ ہمارے اس دور میں کیمونزم کے روسی اور چینی نقطۂ ہائے نظر کو آج ایسے ہی مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ بہرحال تاریخی بنیادوں پر سب سے زیادہ ناقابل قبول ان جدید مسلمان معذرت خواہوں کا موقف ہے جنہوں نے ملت اسلامی کے دورِ اول کے جہاد کی تشریح خالصاً دفاعی اصطلاحات میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآنی قانون سازی

قرآن اوّلاً اور مقدماً مذہبی اور اخلاقی اصولوں اور نصیحتوں اور ہدایتوں کی کتاب ہے اور وہ قانونی دستاویز نہیں، لیکن وہ یقیناً بعض اہم قانونی اعلانات پر بھی مشتمل ہے، جو مدینہ میں ملّی ریاست کے دورانِ تشکیل جاری ہوتے رہے۔ ہم گزشتہ فصل میں بعض معاشی وضع شدہ قوانین کی نشاندہی کر چکے ہیں۔ شراب نوشی پر جس طرح پابندی عائد کی گئی، قرآن کے طریقۂ قانون سازی کی وہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ نیز اس سے خود قانون سازی کی نوعیت اور اس کے عمل کے متعلق قرآن کا جو انداز ہے، اس پر روشنی پڑتی ہے۔ ابتدائی سالوں میں، ظاہر ہے، شراب کی بلا شرط اجازت تھی۔ بعد میں شراب کے نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، اس کے بعد ارشاد ہوا۔

'یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما' (وہ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو۔ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے نفع بھی ہے۔ اور ان کا گناہ نفع سے زیادہ ہے)۔ اور آخر ایک وقت آتا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے۔ انما الخمر والمیسر۔۔۔ رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر (۵۱ - ۹۰ - ۹۱)

(بے شک شراب اور جوا ناپاک شیطانی عمل ہیں۔ اگر تم بھلا چاہتے ہو' تو اس سے بچو۔ بے شک شیطان تمہارے اندر شراب اور جوئے سے عداوت و بغض پیدا کرنا چاہتا ہے) اور اسی طرح شراب نوشی پر پوری طرح پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ جیسے جیسے مسائل پیدا ہوتے تھے' ان سے آہستہ آہستہ تجرباتی طریقے پر قانوناً نمٹا جاتا تھا۔

قرآن کے سب سے اہم قانونی ضابطے اور عمومی اصلاح کے احکام عورتوں اور غلامی کے اُمور کے بارے میں ہیں۔ قرآن نے کئی لحاظ سے عورت کی حیثیت کو بہت زیادہ بہتر بنایا لیکن اس ضمن میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ عورت کی شخصیّت کو پوری طرح تسلیم کیا گیا۔ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا۔ عورت کو مرد کے مقابلے میں وہی حقوق دیئے گئے جو مرد کو اپنی بیوی کے مقابلے میں حاصل ہیں۔ سوائے اس کے کہ —— مرد چونکہ کماتا ہے اور بیوی کے نفقہ کا ذمہ دار ہے' اس لیے وہ بیوی سے ایک درجہ اوپر ہے۔ (الرجال قوامون علی النساء بما انفقوا) غیر محدود تعدد ازدواج کو بڑی سختی سے روکا گیا اور بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر خاوند کو یہ ڈر ہو کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا' وہ ایک ہی بیوی رکھے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ایک عمومی اُصول کا اضافہ کیا گیا' جو یہ ہے خواہ تم کتنا بھی چاہو' تم ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے۔ (فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ۔ ۴ - ۳' ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم ۴ - ۱۲۸) ان احکام کا مجموعی طور پر منطقی نتیجہ یہ ہے کہ عام حالات میں تعدد ازدواج ممنوع ہو۔ تاہم پہلے سے موجود تعدد ازدواج کے ادارہ کو قانونی سطح پر اس واضح رہنمائی کے ساتھ تسلیم کر لیا گیا کہ جب بتدریج معاشرتی حالات زیادہ سازگار رہوں گے' ایک زوجگی کا اجراعمل

میں آجائے گا۔ اور یہ اس لیے کہ کوئی بھی مُصلح جو فعّال اور مؤثر ہونا چاہتا ہے حقیقی صُورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ محض خیالی بیانات جاری کرتا ہے۔ لیکن بعد میں آنے والے مسلمانوں نے تعددِ ازدواج کے بارے میں قرآن نے جن خطوط پر رہنمائی کی تھی، ان پر نظر نہ رکھی اور فی الحقیقت اس کے مقاصد میں روک بنے۔

قرآن نے غلامی کے ادارہ سے اسی طرح بحث کی ہے جیسے خاندان کے متعلق اس کی بحث ہے۔ اس مسئلے کے فوری حل کے طور پر قرآن قانونی سطح پر غلامی کے ادارہ کو تسلیم کرتا ہے، چونکہ اس وقت کے معاشرے کے رگ و پے میں غلامی رچی ہوئی تھی اس لیے اس کا کوئی متبادل ممکن نہ تھا۔ اور اسے راتوں رات پوری طرح ختم کر دینے سے ایسے مسائل پیدا ہوتے، جن کو حل کرنا قطعی طور پر ناممکن ہوتا۔ اور ایک خواب کی دنیا میں رہنے والا ہی ایسا خیالی اعلان کر سکتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی غلاموں کو آزاد کرانے اور ایسی فضا پیدا کرنے کی ہر قانونی اور اخلاقی کوشش کی گئی جس میں غلامی کو ختم ہو جانا چاہیئے، غلام کو آزاد کرنے 'فک رقبۃ' کی نہ صرف بحیثیت ایک نیکی کے تعریف کی گئی، بلکہ اسے اور اس کے ساتھ بھوکے اور یتیموں کو کھانا کھلانا گھاٹی پر چڑھنے کی طرح ایک مشکل کام بتایا گیا، جسے انسان کو لامحالہ سرانجام دینا ہی ہے (فلا اقتحم العقبۃ وما ادرٰک ما العقبۃ فک رقبۃٍ او اطعٰمٌ فی یومٍ ذی مسغبۃ یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً ذا متربۃ) بے شک قرآن نے صاف اور قطعی طور پر مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اگر ایک غلام مرد یا لونڈی قسطوں میں وہ رقم ادا کرکے جو مالک کے ساتھ اس کے حالات کے مطابق طے ہو، آزاد ہونا چاہیے، تو مالک کو اس طرح غلام یا لونڈی کو آزاد کرنے (مکاتبت) کی اجازت دینی ہوگی اور وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے:

والذین یبتغون الکتٰب مما ملکت ایمانکم فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیراً واٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتٰکم ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء ان اردن تحصناً لتبتغوا عرض الحیٰوۃ الدنیا ومن یکرھھن فان اللہ من بعد اکراھھن غفورٌ رحیم (۲۴ - ۳۳) (اور جو لوگ تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے رقم ادا کر کے آزاد ہونے کے لیے) مکاتبت کرنا چاہیئں، ان کے ساتھ مکاتبت کر لو اگر تم ان میں کچھ اچھائی پاؤ اور جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے، اس مال میں سے ان کو دو

اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری کے واسطے مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہیں تاکہ اس طرح تم دنیوی زندگی کا تھوڑا سا فائدہ حاصل کرو اور جو ان لونڈیوں کو بدکاری کے واسطے مجبور کرے تو اللہ ان کی مجبوری کے بعد ان کو بخشنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے)۔ یہاں پھر ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں، جس میں قرآنی اندازِ فکر کی صاف و واضح منطق کو مسلمانوں کی طرف سے تاریخ میں واقعتاً بروئے کار آنے نہیں دیا گیا، قرآن کے یہ جو الفاظ ہیں کہ اِن علمتم فیہم خیرا (اگر تم ان میں اچھائی دیکھو) اگر انہیں صحیح طرح سمجھا جائے تو ان کے صرف یہی معنی نکلتے ہیں کہ اگر ایک غلام کمانے کی صلاحیت ظاہر نہیں کرتا تو اس صورت میں اگر وہ آزاد بھی کر دیا جائے تو اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکے گا۔ اس لیے ان حالات میں خود اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ کم سے کم اپنے مالک ہی کی حفاظت میں رہے۔

غرض یہ مثالیں بڑی اچھی طرح سے واضح کرتی ہیں کہ جہاں قرآن کی قانون سازی کی روح نئی قانون سازی میں آزادی اور ذمہ داری کی بنیادی انسانی قدروں کے ترقی پسندانہ عملی اظہار کی طرف صریح رجحان رکھتی ہے، وہاں اس کے باوجود قرآن کو اپنی واقعی قانون سازی میں ایک حد تک اس معاشرہ کو جو اس وقت موجود تھا بطور ریافت طلب مسائل کے قبول کرنا پڑا۔ اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ قرآن کی جو واقعی قانون سازی تھی، خود قرآن کے نزدیک وہ اپنے ظاہری لفظی معنی میں ابدی مراد نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت واقعی کا قرآن کے ابدی ہونے کے عقیدہ یا اسی سے مربوط یہ جو عقیدہ ہے کہ قرآن لفظاً نازل ہوا ہے یا معناً اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال جلد ہی مسلمان فقہاء اور علماء کلام نے اس مسئلے کو الجھانا شروع کر دیا اور قرآن کے خالصاً قانونی احکام کے بارے میں یہ سمجھا جانے لگا کہ ان کا اطلاق ہر معاشرے پہ ہو سکتا ہے، خواہ اس کے کیسے ہی حالات ہوں، کیسی ہی اس کی ساخت ہو اور کیسی ہی باطنی قوائے محرکہ ہوں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسلمان فقہاء زیادہ سے زیادہ لفظ پرست ہوتے گئے، اس کا ایک کھلا ثبوت اس حقیقت واقعی سے ملتا ہے کہ دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے دوران اسلامی فقہ نص اور نص سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے، ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ تفریق کرنے لگی۔ یہ بات ماننے کے لیے کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ بہت شروع کے زمانے میں مسلمان خاصی آزادی سے قرآن کی تعبیر و تشریح کرتے تھے۔ لیکن پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی)

کے آخر اور پوری دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں (اس کی نمایاں خصوصیات جن کا ذکر ہم تیسرے اور چوتھے باب میں کریں گے، حدیث کا فروغ اور قیاس کی نشوونما اور ارتقاء تھیں) فقہاء نے خود اپنے آپ کو اور ملّت کو قرآن کے متن یعنی نص کا خوب پابند کر لیا۔ یہاں تک کہ اسلامی قانون اور اسلامی دینیات کا تمام حاصل لفظ پرستی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا۔

ان صدیوں میں مسلمانوں نے مختلف نقطۂ ہائے نظر سے اور مختلف یقیناً متضاد رجحانات کے تحت صرف قرآن کی بیشمار تفسیریں نہیں لکھیں، بلکہ انہوں نے علم تفسیر کو بھی ترقی دی جس کے مددگار علوم میں عربی صرف و نحو، عربی لغت، حدیث نبوی اور قرآن کی آیات کا شان نزول وغیرہ شامل تھے۔ مسلمان اہل علم کا دعوٰے ہے اور یقیناً یہ بہت حد تک انصاف پر مبنی ہے کہ تمام اسلامی علوم سوائے ان علوم کے جو تمام تر دنیوی ہیں، قرآن سے نکلے ہیں۔ قرآن نے عربی ادب کے ارتقا اور اس کے اسلوب پر بھی بے حساب اثر ڈالا ہے اور آج کے دن تک وہ اثر ڈال رہا ہے۔

قرآن کے اعجاز کا عقیدہ صرف اس کے مضامین و مطالب میں نہیں، بلکہ ادبی اسلوب میں بھی مسلمانوں کے تقریباً تمام مکاتب فکر کے ہاں مسلّم ہے۔ اس عقیدے نے ایک بنیادی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اسے بہت سی کتابوں میں بالخصوص وہ جو خاص طور سے اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، پیش کیا گیا ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں نے قرآن کے عربی متن کے بغیر اس کے کسی زبان میں ترجمے کو چھاپنے کی کوشش کی بڑی سخت مخالفت کی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے اتحاد میں جو دنیا بھر میں روزانہ پانچ وقت کی نمازوں میں عربی میں قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، کچھ کم مدد نہیں ملی۔ صرف کمالی ترکی میں پچھلے دنوں قرآن کا ترکی میں ترجمہ ہوا، اور اس ترکی ترجمے کو اصل عربی متن کے بغیر چھاپا گیا، اگرچہ نمازوں میں قرآن کا عربی متن ہی تلاوت کیا جاتا رہا۔ لیکن ترکی میں بھی اب عام تلاوت کے لیے قرآن کے عربی متن ہی کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ البتہ اسے سمجھنے کی خاطر عربی متن کے ساتھ مقامی زبانوں کے ترجمہ کو چھاپنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

قرآن کی تفسیر

رسول اللہ صلعم کی زندگی میں قرآن بہت سے لوگوں کو حفظ یاد تھا اور نمازوں میں اس کی

تلاوت کی جاتی تھی، نیز وہ پتوں، ہڈیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر جو اس وقت دستیاب تھیں لکھا ہوا تھا۔ پورا قرآن خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے ایک جگہ جمع کرایا، تاہم قرآن کا وہ متن جسے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، وہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کے زمانے کا ہے جنہوں نے ایک مجلس کی سفارش پر جو آنحضرت صلعم کے وفادار خادم زید بن ثابت کی صدارت میں خاص اس مقصد کے لیے مقرر کی گئی تھی، قرآن کو اس طرح مرتب کیا، جیسا وہ اس وقت ہے۔ قرآن کی یہ ترتیب نزول کے اعتبار سے تاریخ وار نہیں، بلکہ اس کے برخلاف کم و بیش سورتوں کی لمبائی پر مبنی ہے۔

جہاں اس امر کا کچھ ثبوت ملتا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے بعد بہت شروع کی نسل کے لوگ قرآن کی کسی قسم کی تعبیر کرنے میں تامل کرتے بلکہ اس کے مخالف تھے، وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نقطہ نظر کی جگہ بہت جلد قرآن کی تعبیر و تشریح کی ایسی کتابوں نے لے لی جو بہت حد تک نئے نئے اسلام لانے والوں کے عقائد اور ان کے قدیم افکار و خیالات میں رنگی ہوئی تھیں۔ اس قسم کی تشریحات جو قرآنی متن کے واضح معانی سے اکثر نمایاں طور پر ہٹی ہوئی تھیں اور ان میں من مانی باتیں ہوتی تھیں، ان کی تفسیر بالرائے قرار دیکر بہت سخت مخالفت کی گئی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں رائے یا شخصی رائے کا کیا کردار تھا، ہم اس پر زیادہ تفصیل سے پانچویں باب میں جہاں قانون پر بحث کی جائے گی، گفتگو کریں گے۔

چنانچہ بعض ایسے علمی طریقوں کو ترقی دینے کی ضرورت محسوس کی گئی جن کی مدد سے علم تفسیر کی نشوونما پر قابو رکھا جا سکے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ قرآن کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے نہ صرف عربی زبان کا بلکہ عہد نبوی کے عربی اسالیب و محاورات کا جاننا بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے نتیجے میں عربی صرف و نحو، عربی لغت اور عربی ادب کو بڑے زوروں سے ترقی دی گئی۔ اس کے بعد کلام اللہ کے صحیح معانی کا تعین کرنے کے لیے ایک ضروری مدد کے طور پر آیات کا شان نزول منضبط کیا گیا، تیسرے تاریخی حدیث کو جو ان روایات پر حاوی تھی کہ جن لوگوں میں پہلے پہل قرآن اُترا، انہوں نے اس کے احکامات اور بیانات کو کیسے سمجھا بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ ان شرائط کے پورا ہونے کے بعد انسانی عقل کو غور و فکر کرنے کا آزادی تھی۔

الطبری (وفات ۳۱۰ ہجری - ۹۲۲ عیسوی) نے اپنی ضخیم کتاب میں تفسیر کے بارے میں حدیث کا ایک بڑا مجموعہ جس کی بنیاد پہلوؤں کی روایات تھیں، مرتب کر دیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور متعدد مکاتب فکر وجود میں آئے اور اسلام کی عقلی اور روحانی زندگی نے ترقی کی تو بڑی کثرت سے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں۔ یقیناً یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ مسلمانوں کو جو خیالات بھی پیش کرنا اور جن خیالات کی بھی تائید کرنا تھا، وہ قرآن کی تفسیروں کی صورت میں پیش کیے گئے۔

قرآن کی زبان اور اس کے اسلوب نے عربی ادب کی نشو ونما اور ترقی پر بھی بہت زبردست اثر ڈالا ہے۔ مسلمانوں نے شروع ہی میں قرآن کے ادبی اور فنی اعجاز کے عقیدہ کو تسلیم کر لیا لیکن ایک غیر مسلم عرب تک کے نزدیک بھی آج کے دن تک قرآن ایک مثالی ادبی شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخالفوں کی طرف سے رسول اللہ صلعم کو جو شاعر کہا جاتا تھا، قرآن نے بڑی سختی سے اس کی تردید کی ہے اور قرآن کو شعر کہنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ تاہم وہ اپنے احساس کی گہرائی اپنے مؤثر اظہار بیان اور اپنے پُر اثر ترنم میں بلند ترین درجے کی شاعری سے کم نہیں۔ مسلمانوں نے قرآن پڑھنے کی ایک خاص طرز کو جسے "تجوید" کہا جاتا ہے، ترقی دی ہے۔ اور جب قرآن کی اس طرح تلاوت کی جاتی ہے تو عربی نہ جاننے والا سامع تک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری زبان کے ترجمے میں قرآن کے ادبی حسن اور جلالت شان کو قائم رکھنا ممکن ہے۔ ہم یہاں قرآن کے مختلف اوقات میں نازل شدہ تین ٹکڑے دے رہے ہیں، اس خیال سے نہیں کہ یہ قاری کو قرآن کی فنی برتری سے آشنا کریں، بلکہ اس لیے کہ ان سے قرآنی مطالب کا جس طرح درجہ بدرجہ ارتقا ہوا، اس کی ایک تصویر سامنے آ جائے گی۔

پہلا ٹکڑا شروع کے مکّی دور کی ایک سورۃ کا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

فاما الانسان اذا ما ابتلٰه ربه فاکرمه ونعمه فیقول ربی اکرمن واما اذا ما ابتلٰه فقدر علیه رزقه فیقول ربی اهانن کلا بل لا تکرمون الیتیم ولا تحٰضون علی طعام المسکین وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما کلا اذا دکت الارض دکا دکا وجاء ربك والملك صفا صفا۔ (۸۹ - ۱۵ - ۲۲)۔

(آدمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو آدمی کہتا ہے کہ میرے رب نے میری عزت کی اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے، اور اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے، تو آدمی کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔ نہیں نہیں۔ بلکہ (یہ اس لیے ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور محتاج کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں کرتے اور وراثت کا مال سمیٹ کر کھاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔ نہیں نہیں جب زمین کوٹ کوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے)

مندرجہ ذیل آیات مکی دور کے آخر کی ہیں:۔

قد افلح المومنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون والذین هم عن اللغو معرضون والذین هم للزکوٰة فاعلون والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک هم العادون والذین هم لامانتهم و عهدهم راعون والذین هم علی صلوتهم یحافظون اولئک هم الوارثون الذین یرثون الفردوس هم فیها خالدون۔ (۲۳-۱-۱۱)-

(بے شک فلاح پا گئے مومنین جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع کرتے ہیں اور جو بری باتوں سے بچتے ہیں اور جو زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان (لونڈیوں) کے جو ان کے دائیں ہاتھوں کی ملکیت ہیں۔ پس اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ سو جو اس سے آگے بڑھے، تو وہ زیادتی کرنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور عہد و قرار کو پورا کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں میراث پانے والے، جو جنت کو میراث میں پائیں گے اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یہ آیات ایک مدنی سورۃ کی ہیں۔

سورة انزلناها وفرضناها وانزلنا فیها آیات بینات لعلکم تذکرون الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذکم بهما رافة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الاخر ولیشهد عذابهما طائفة من المومنین الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة والزانیة لا ینکحها الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المومنین والذین

يرمون المحصنت ثم لم يأتوا بأربعة شهداء فاجلدوهم ثمنين جلدة ولا تقبلوا لهم شهادةً

ابداً اولئك هم الفاسقون الا الذين تابوا من بعد ذلك واصلحوا۔ (۲۴-۱-۵)

(یہ سورہ ہے جو ہم نے اتاری اور اسے فرض کیا اور اس میں ہم نے واضح نشانیاں اتاریں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ زانی مرد اور زانی عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اللہ کے حکم کی فرمانبرداری میں تمہارا ان پر ترس کھانا مانع نہ ہو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور مومنین کی ایک جماعت ان دونوں کو سزا دیا جانا دیکھے۔ زانی مرد سوائے زانی عورت اور مشرک عورت کے کسی سے شادی نہیں کرے گا اور زانی عورت سوائے زانی مرد اور مشرک مرد کے کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ اور مومنوں پر یہ سب حرام ہے اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر اتہام لگاتے ہیں پھر وہ چار گواہ نہیں لاتے۔ پس ان کو اسّی کوڑے مارو ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ بدکار ہیں۔ مگر جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی)